

نواز شریف۔ لیڈر یا سیاستدان؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

(آخری قسط)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر عزیزم خوردشید ندیم کا یہ فتویٰ پڑھ کر مجھے دھچکا لگا کہ بھٹو نے اقتدار کے لئے ملک تقسیم کر دیا حالانکہ میں جیالا ہرگز نہیں ہوں لیکن ذوالفقار علی بھٹو کے آمرانہ طرز حکومت پر اعتراضات کے باوجود اس کی قائدانہ صلاحیتوں کا قائل اور مداح ضرور ہوں بلکہ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ پاکستان میں جمہوریت کی اصل دشمن وہ تو تھیں جس جنہوں نے پہلے پہل لیاقت علی خان کو گوگی مروا کر پاکستان کو قیادت کے فقدان میں مبتلا کر کے جمہوریت کی پٹری سے اتار دیا اور بیوروکریسی کی گود میں ڈال دیا جس کا منطقی نتیجہ 1958ء کا مارشل لا لگا اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی چڑھا کر پاکستان کو ایک مقبول لیڈر اور اہلسیاست دان سے محروم کر دیا۔ بھٹو زندہ رہتے تو زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیرداروں اور وڈیروں کے مفادات پر بھی زد پڑتی اور آہستہ آہستہ ملک جمہوریت کی منزل کی جانب بھی گامزن رہتا۔ خود بخوبی اپنی پالیسیوں کے اثرات اور مضمرات سے سبق سیکھتے اور اپنا طرز حکومت بہتر بناتے۔ سوچئے تو آج پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ بلکہ گزشتہ کئی دہائیوں سے پاکستان کا اہم ترین مسئلہ کیا رہا ہے؟ میرے نزدیک پاکستان لیڈر شپ کے شدید بحران اور فقدان کا شکار ہے۔ اس وقت عوامی رائے کے سروے کے مطابق میاں نواز شریف ملک کے مقبول ترین لیڈر ہیں حالانکہ انتخابات میں انہیں صرف پنجاب میں سیاسی برتری حاصل ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ اقتدار سے باہر ہیں اور ان کے مدد مقابل زررداری صاحب ہیں جن سے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو زندہ رہتیں تو یہ صورت نہ ہوتی۔ ماشاء اللہ زررداری صاحب نے خلوص نیت سے چن چن کر بھاری پتھرائی کشمی میں رکھے ہیں اور کچھ اس قسم کی بے بسیرتی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کے نقادوں کا یہ تیہرہ پڑھ کر ان سے بھردی ہوتی ہے کہ ”پینچلر پارٹی کی کشمی ڈبو نے کے لئے زررداری صاحب ہی کافی ہیں۔“ اس پس منظر میں میاں صاحب کا مقبول ترین لیڈر ہونا قابل فہم ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستانی عوام کسی تیسری سیاسی قوت کی تلاش میں ہیں۔ اب تلاش کے اس غلاء کو کون پر کرتا ہے، خدای بہتر جانتا ہے۔ بات دور نکل گئی، معذرت۔ اب آپ اپنے تاریخی پس منظر میں جھانک کر دیکھیں اور موجودہ سیاسی بحران کے آئینے میں تجزیہ کریں تو محسوس ہوگا کہ لیاقت علی خان اور ذوالفقار علی بھٹو کا نقل ہماری تاریخ کے عظیم سامنے تھے جنہوں نے ملک کو قیادت کے فقدان کا شکار کر دیا اور آج وہ فقدان اپنی انتہا پر پہنچ چکا ہے جس کے سبب قوم میں مایوسی اور بددیچخیل رہی ہے، حوصلے پست ہو رہے ہیں، خواب مر جھا رہے ہیں، جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں بخلی جنم لے رہی ہے اور ملکی بھلاہ اور استحکام کو مشک و شبہات کی گرد نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ملکی بھلاہ کو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ مسئلہ فقط اتنا سا ہے کہ جب کوئی نیا کشمکش علی آفاق پر نمودار ہوتا ہے جیسا کہ نیٹو اور امریکی فورسز کے ہمارے بارڈر پر افغانستان کے اندر اجتماع سے پیدا ہوا تو میڈیا یا اسے اچھا لتا ہے، کچھ کالم نگار قوم کو خوف کے نگہکش لگاتے ہیں اور لوگ یہ سوچ کر سہم جاتے ہیں اور دوسموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اس کشمکش کا جواب دینے کے لئے جس قدر اہل قیادت کی ضرورت ہے، وہ اس وقت پاکستان کو میسر نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس وقت پاکستان کی قیادت اہل ہاتھوں میں ہوتی تو نہ لوگوں کے حوصلے پست ہوتے اور نہ ہی لوگ بھلاہ کے دشمن میں نگر مند ہوتے۔

پاکستان افغانستان کی سرحد پر اتحادی فوجیں اکٹھی ہوئیں تو ہمارے سابق جرنیل حضرات اور دانش ور حملے کی کھینچاں بھانے لگے اور یوں تاثر پیدا کیا جیسے امریکہ پاکستان کو فتح کر کے عراق بنانا چاہتا ہے۔ حالانکہ کامن سنس واضح طور پر بتا رہی تھی کہ امریکہ ہرگز پاکستان پر حملہ کرنے کا نہی قبضہ۔ ان فوجوں کے اجتماع کا مقصد فقط پاکستان کے سرحدی علاقوں سے طالبان، القاعدہ اور انتہاپسندوں کے افغانستان پر حملے روکنا ہے اور پاکستانی علاقوں میں ان کے گھمکانوں کا سراغ لگا کر انہیں ختم کرنا ہے۔ گرم تعاقب اور ہوائی حملوں کا سلسلہ جو پہلے ہی جاری تھا، فقط اس میں نئی منصوبہ بندی اور قوت کا اضافہ کیا جا رہا تھا کیونکہ امریکہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پاکستان پوری قوت سے اس مسئلے کو جڑ سے اکھاڑنے میں ناکام رہا ہے اور دوم یہ کہ پاکستانی ایجنسیاں — خفیہ ادارے — کچھ انتہاپسندوں کی مدد کر رہے ہیں۔ اس رائے کو افغانستان میں القاعدہ کے آرپی سیل چیف مصطفیٰ اویلازیڈ شیخ سعید کے اکلوتے بیوٹی وی انٹرویو سے بھی تقویت ملتی ہے جس میں ان کے الفاظ یہ تھے ”آج بھی مجاہدین ترکوں میں بھر کر افغانستان آتے ہیں اور یہ تعاون بھی خفیہ ایجنسیوں کی بدولت ہے“۔ دوسری طرف ہمارے سابق جرنیل امریکی حملے کی پیش گویاں کر کے نہ صرف قوم کو اندیشوں میں مبتلا کر رہے تھے بلکہ دنیا بھر میں پاکستان کی بقاء کو مشکوک بنانے میں مصروف تھے۔ میں نے لندن کے جنگ میں اپنے سیاسی جرنیل حمید گل کا یہ بیان پڑھا تو گہری سوچ میں ڈوب گیا جس کی سرخی یہ تھی کہ امریکہ پاکستان پر 20 جولائی سے پہلے حملہ کر دے گا۔ شکر الحمد للہ کہ آج 26 جولائی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ جرنیل جونو ج میں بھی سیاسی جرنیل ہی سمجھے جاتے تھے، اب ماشاء اللہ پیشر و بیان باز بن چکے ہیں اور ٹی وی پر چہرہ دکھائے بغیر اور بیانات چھپوائے بغیر ان کا کھانا نہضم نہیں ہوتا۔ فرووری کے آخر میں ایک دن ٹی وی لگا یا تو جناب مرزا اسلم بیگ صاحب کو یہ فرماتے ہوئے اپنے کانوں کو اس وقت صدر پرویز مشرف کو فوج نے اپنی تحویل میں لیا ہوا ہے اور ان سے اقتدار سے رخصتی اور جلا وطنی کی تفصیلات طے ہو رہی ہیں۔ انہی دنوں جنرل حمید گل صاحب نے بھی یہ انکشاف کیا تھا کہ پرویز مشرف چند دنوں میں مستعفی ہو جائیں گے۔ میں ان جرنیلی بیانات پر ندامت محسوس کر رہا تھا کیونکہ ہر شخص کو یہ علم تھا کہ جنرل پرویز مشرف بلا مضطر صدر اعلیٰ میں موجود ہیں، موہیں کر رہے ہیں اور وہ کبھی استعفیٰ نہیں دیں گے نہ ہی فوج نے ان کو اپنی تحویل (custody) میں لیا ہوا ہے۔ ان بیانات کی سیاسی خشک ہوئے نصف برس گزر چکا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ہم کتنی ”خوش قسمت“ قوم ہیں جسے اس طرح کے صاحبان بصیرت (visionary) جرنیل اور جوہر قابل نصیب ہوئے ہیں۔ اسی پس منظر میں مجھے عزیز مہر خورد شیدنیم کے اس خطے سے ہرگز اتفاق نہیں کہ ”آج ملک و قوم کو بقاء کا چشم دید پیش ہے..... جب یہ بقاء یعنی ہو جانے کو پھر خواہوں کے سفر پر نکلا جائے..... امریکہ اور نیٹو کی افواج ہماری سردلوں تک آگئی ہیں۔ کیا

اب بھی کسی رومانوی فضا میں جینے کا کوئی جواز ہے۔ اس جنگ کو ایک لیڈر ٹال سکتا ہے سیاست دان نہیں۔“ امریکی اور نیٹو فورسز طویل عرصے سے ہماری سرحدوں کے قریب تھیں اور ہمارے سرحدی علاقوں پر حملے بھی کرتی رہتی تھیں۔ یقین رکھئے کہ امریکی افواج نہ ہی ہماری فوج سے جنگ کر کے دہشت گردی کے خلاف اپنے ایک ساتھی (Allie) کو کمزور کریں گی جس کا نتیجہ امریکہ دشمن دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی ہوگا اور نہ ہی وہ ہمارے کسی علاقے پر طویل قبضہ کریں گے۔ انشاء اللہ پاکستان کے وجود اور بقا کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ خدا را ان مفروضوں کو ہوا دے کر قوم کے حوصلے پست نہ کریں کیونکہ پہلے ہی کچھ کالم نگار حضرات پاکستان کو امریکہ سے نہرو آڑا مہونے کے لئے لگا رہے ہیں جبکہ کچھ فوری طور پر امریکہ کی عسکری قوت سے خوفزدہ کر کے ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ انشاء اللہ یہ نوبت نہیں آئے گی۔ اگر اس وقت پاکستان کو کوئی چیلنج درپیش ہے تو وہ چیلنج داخلی انتشار اور سیاسی بحران کے حوالے سے ہے جو ہماری نااہل قیادت کی نالائقی کا شاخسانہ ہے۔ ہاں تو بات شروع ہوئی تھی عزیزم خورشید ندیم کے اس بیان سے کہ بھٹو نے اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے ملک کی تقسیم کی حقیقت کو قبول کر لیا۔ یوں تو میں شرقی پاکستان کی علیحدگی پر اپنی کتاب ”پاکستان کیوں ٹوٹا“ میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں لیکن مختصر یہ کہ بھٹو کو ملک کی تقسیم کا مورد الزام ٹھہراتا ہے انصافی ہے۔ بھٹو اس سارے سیاسی منظر نامے میں ایک اہم کردار ضرور تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کا ٹوٹنا جس سیاسی عمل اور احساس محرومی کا نتیجہ تھا، اسے فوج کی غیر سیاسی اور بے بصیرت حکمت عملی نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا اور جب شیخ مجیب الرحمن کی سیاسی قوت کا جن یحییٰ خان کی بدولت یوں سے نکل کر شرقی پاکستان پر چھا گیا تو اسے سیاسی حکمت عملی کے ذریعے قابو کرنے کی بجائے مارچ 1971ء میں آرمی ایکشن کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی گئیں، دراصل ملک اسی وقت ٹوٹ گیا تھا۔ باقی سب رعبی کارروائی تھی جسے یحییٰ خان نے نہایت خلوص سے فوجی طریقے اور سٹاف کالج کے انداز میں پورا کر دیا۔ اس لئے میں تاریخ کے تناظر میں بھٹو کو ملک ٹوٹنے کا ذمہ دار نہیں سمجھتا البتہ یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ بھٹو نے اس موقع پر فوجی حکمرانوں کا ساتھ دیا جبکہ اسے سیاسی قوت کے ذریعے جرنیلوں کا راستہ روکنا چاہئے تھا جسے وہ روک تو نہیں سکتے تھے لیکن تاریخ میں سرخرو ہو جاتے۔ آپ دیکھ لیں کہ بلوچستان میں بے چینی کے انکار سے بھڑک رہے ہیں لیکن پاکستان کی فوجی حکومت نے سردار اکبر بگٹی مرحوم سے گفتگو کے ذریعے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی بجائے اسے اپنی اتان کی ہیمنٹ چڑھا دیا اور ایک بار پھر شرقی پاکستان کے زخموں کو تازہ کر دیا بلکہ یحییٰ خان کی یاد تازہ کر دی۔ کیونکہ ہمارے جرنیل تاریخ سے سبق سیکھتے ہیں نہ انہیں نتائج کی پرواہ ہوتی ہے اس لئے کہ آج تک ان کا احتساب ہوا ہے نہ انہیں ان کے کارناموں کی سزا ملی ہے۔ عزیزم خورشید نے قائد اعظمؒ، لیاقت علی خان اور تحریک پاکستان کے حوالے سے بھی رومان اور حقیقت کے فلسفے کی روشنی میں کچھ تبصرے کئے ہیں جن پر لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر کبھی۔ انشاء اللہ



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

**Nawaz Sharif - Leader...**

July 27th, 2008

[Urdu Khana Pakana Recipes](#)

1000's of Pakistani Food & Cooking Recipes & Videos in Urdu.

[Tongkat Ali at 65% Off](#)

Buy High Potency (50/1) Tongkat Ali Guaranteed Results - Now at 65% Off

## نواز شریف۔ لیڈر یا سیاستدان؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

میں عام طور پر عزیزم خورشید ندیم کی تکبیر مسلسل کو اس لئے پڑھتا اور ”سنتا“ ہوں کہ مجھے کبھی کبھی اس میں اپنی جوانی کی جوان سال سوچ کی چاپ سنائی دیتی رہے ہیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثر اوقات جوانی کی رومانی سوچ حقائق کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور جوانی کے رومانس بھرے خواب زندگی کے حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جوانی کے اپنے تھے اور مجبوریاں ہوتی ہیں جبکہ بڑھاپے کے اپنے تھے اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ جس طرح انسان جوانی کے رومانس اور خوابوں سے گزر کر بڑھاپے کے تجربات اور حقائق تک پہنچتا ہے اسی طرح سیاستدان بھی رومانس اور خوابوں سے گزر کر زمینی حقائق کا ادراک حاصل کرتا اور لیڈر بنتا ہے ورنہ وہ محض سیاستدان ہی رہ جاتا ہے اور لیڈر کبھی نہیں بن سکتا۔ قائد اعظم اور بھٹو کے ساتھ سیاستدانوں کا ایک گروہ موجود تھا لیکن ان میں سے لیڈر کتنے بنے؟

اس وقت میں ملک سے ہزاروں میل دور افغانستان کے ایک دور افتادہ قصبے میں ہوں جہاں مجھے آئے ہوئے تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ میرے پاس نہ فون ہے، نہ انٹرنیٹ اور نہ ہی کیبل ٹی وی۔ چنانچہ کبھی کبھار کوئی مہربان لندن سے اخبارات، مجلہ دیاں یا لندن جنگ کے دفتر سے بذریعہ ڈاک پرانے اخبارات مل جائیں تو ملکی صورتحال کی خبر ملتی ہے ورنہ ”بے خبری“ بڑی نعمت ہے۔

آج ڈاک سے مجھے لندن کا جنگ ملا تو خورشید ندیم کا کالم بعنوان ”نواز شریف۔ لیڈر یا سیاستدان؟“ پڑھنے کا موقع ملا۔ یوں تو اس کالم کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اختصار کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ عزیزم ندیم نے لکھا ہے کہ ”روٹی کیڑا اور مکان ایک رومان تھا۔ جاگیر داری کا خاتمہ ایک خواب تھا بھٹو نے جب اس رومان کو نعرہ بنایا اور اس خواب کو تعبیر دینے کا دعویٰ کیا تو عوام ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ خواب کو تعبیر نہیں مل سکتی تھی اگر اقتدار نہ ملتا۔ اقتدار کے لئے زیادہ سے زیادہ نشستوں پر کامیابی ضروری تھی۔ یہ کامیابی مقدر نہ بن سکتی تھی اگر جاگیر داروں کو ٹکٹ نہ دیئے جاتے۔ بھٹو صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ انتہائی نتائج آئے تو معلوم ہوا کہ ملک کو متحد رکھ کر اقتدار نہیں مل سکتا۔ اقتدار کے لئے ملک کی تقسیم ضروری تھی۔ اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا۔ حقیقت پسند ہوئے تو اقتدار مل گیا لیکن اس سفر میں خواب بکھر گئے“ اس لہجے میں خورشید ندیم نے تحریک پاکستان اور قائد اعظم کا ذکر کیا ہے جس سے مجھے یہ کالم لکھنے کی تحریک ہوئی ہے۔

دراصل بھٹو صاحب ایک رومانی سیاستدان تھے، رومانس اور رومانی سوچ ان کی شخصیت کے ناگزیر پہلو تھے۔ روٹی کیڑے اور مکان سے قبل ان کا رومانس کشمیر سے تھا اور اسی رومانس کی بدولت وہ ایوب کی آمرانہ حکومت میں وزیر ہونے کے باوجود مغربی پاکستان اور بالخصوص پنجاب میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کر چکے تھے۔ ایک نوجوان، ذہین اور باصلاحیت وزیر ہونے کے ناطے طالب علموں کا ایک حلقہ ان کا شیدائی اور حمایتی بن چکا تھا۔ ایوبی آمریت کے خلاف صحیح وقت پر بغاوت کر کے وہ نوجوانوں کے ہیرو بن گئے اور قوم کا وہ حصہ جو مادر ملت کی شکست کے بعد دل شکستہ ہو چکا تھا اور اپنے مجروح جذبات کا انتقام لینے کے لئے بے چین تھا اس طبقے نے بھٹو صاحب کو بغاوت اور آزادی کی علامت کے طور پر دلوں میں بسالیا۔ چنانچہ ان کا ہر جگہ والہانہ استقبال ہونے لگا۔ جیل جا کر بھٹو صاحب نے نوجوانوں اور سیاسی کارکنوں کے جذبات کو بھڑکا دیا اور وہ ایک مقبول لیڈر بن گئے۔ ان کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے دو لڑنے والے جیسے لیڈر نہ ہی صرف مسٹر دھندہ تھے اور ماضی کے کارناموں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے بلکہ ان کی شخصیات کی راکھ میں چنگاریوں کی تش بھی عطا تھی۔ اس مرحلے پر انہوں نے روٹی کیڑے اور مکان سے رومانس شروع کیا، جوان کا خواب بھی تھا۔ اگر انہیں اس سے قبل عوامی مقبولیت حاصل نہ ہوتی اور وہ اپنی کرشمہ ساز شخصیت کے بدولت عوام اور خاص طور پر نوجوانوں کے ہیرو نہ بن چکے ہوتے تو محض روٹی کیڑے اور مکان کا نعرہ انہیں سیاستدان سے لیڈر نہ بنا سکتا۔ اسی طرح اگر قائد اعظم ایک طویل سیاسی جدوجہد اور اصولی سیاست کے سب پاؤں پر سیاستدان نہ بن چکے ہوتے تو ان کے علیحدہ مسلمان ریاست کے مطالبے کا وہی حشر ہوتا جو چودھری رحمت علی کی پاکستان موومنٹ کا ہوا۔ اگر نواز شریف 2007-08ء میں عوام کے دلوں کے قریب نہ ہوتے تو ان کے آزاد وطن اور عدلیہ کے نعرے کا وہی انجام ہوتا جو آج قاضی حسین احمد اور عمران خان کے عدلیہ پر موقف کا ہو رہا ہے۔

بغور دیکھیں تو ہر سیاستدان کسی نہ کسی رومانس کا شکار ہوتا ہے لیکن اصل بات اس رومانس اور خواب کو عملی جامہ پہنانا ہوتی ہے۔ تاریخ سیاستدان اور لیڈروں کو اسی کسوٹی پر پرکھتی ہے ورنہ انہیں ناکام اور شعبہ باز قرار دے دیتی ہے۔ بھٹو صاحب نے روٹی کیڑا اور مکان کے رومان کا نعرہ بنا کر ووٹ تو حاصل کر لئے لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت میں آنے کے بعد انہوں نے اس نعرے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا کیا؟ کیا ان کی سیاسی اور معاشی طور پر مشکل حکومت نے ایسے اقدامات کئے جن سے محروم طبقوں کو روٹی، کیڑا اور مکان مل سکتا؟ ایسا کرتے تو رجائیت پسند اور رومانی نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے مایوس ہو کر الگ نہ ہو جاتی۔ محروم طبقوں کا ایک بڑا حصہ آج بھی بھٹو کا گرویدہ اور بی بی کا لپکا وڈر ہے کیونکہ بھٹو صاحب نے انہیں آزادی کے تصور سے آشنا کیا، ان کے لبوں پر لگے ہوئے تالے توڑے اور ان کی آواز خودی کو جگایا، ورنہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھٹو حکومت روٹی کیڑا اور مکان کا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہی۔ اس لئے دانشوروں اور مورخین کا ایک گروہ ان کے نعرے کو محض سیاسی شعبہ بازی قرار دیتا ہے۔ رہا جاگیر داری اور زمینداری کے خاتمے کا وعدہ تو یہ تجربہ کرنے کے باوجود کہ 1970ء کے انتخابات میں عوام نے بھٹو کے کھبوں کو بھی ووٹ دیئے تھے اور ان کے غیر معروف امیدوار بڑے بڑے سیاسی سومنات توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے، انہوں نے عوامی مقبولیت کی اس لہر اور کیفیت کو پنپتے بنانے کی بجائے اقتدار میں آکر بڑے بڑے جاگیر داروں اور وڈیروں کو پارٹی میں شامل کر لیا، انہیں سیاسی عہدے دے کر تخلص کارکنوں اور عوام کو مایوس کر دیا اور نتیجے کے طور پر پی پی پی اپنی انقلابی روح کھینچی۔ ہو سکتا ہے عزیزم خورشید ندیم اسے رومان اور حقیقت پسندی کے درمیان توازن قرار دیں جس پر انہوں نے بڑا زور دیا ہے لیکن میرا مشاہدہ اور مطالعہ اس رومان کو ایک اصولی موقف اور قومی خواب سمجھتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ جب سیاستدان اپنے اصولی موقف اور قومی خواب سے دستبردار



ہو جائیں اور رومان اور زمینی حقائق کے درمیان توازن پیدا کرنے کے لئے مصلحتوں کو سینے سے لگالیں تو تاریخ اسے شعبہ بازی سے تعبیر کرتی ہے۔ عوام کے جذبات کو بھیس لگتی ہے اور سیاستدان کے الفاظ تاثیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح خورشید کے الفاظ میں جب سوویت یونین بکھرا تو لینن اور مارکس کے جھنڈوں کے گلے میں جوتوں کے ہار تھے۔ ایسا تو نہیں لیکن صورتحال اس کے قریب قریب ہوتی ہے۔ قائد اعظم اگر برطانوی دباؤ اور کانگریس مخالفت اور نوڈی مسلمانوں کے کردار جیسے زمینی حقائق سے سمجھوتہ کر لیتے اور پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو جاتے تو تاریخ انہیں محض سیاستدان اور شعبہ بازی کی حیثیت سے یاد کرتی اور وہ ہرگز قائد اعظم نہ بن سکتے۔ ذوالفقار علی بھٹو اگر جاگیرداروں اور وڈیروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے عوامی حمایت کو مضبوط، پائیدار اور وسیع بنانے کی حکمت عملی پر عمل کرتے جو ان کا رومان تھا اور وہ سیاسی مصلحتوں کا شکار نہ ہوتے تو عالمی تاریخ میں وہ انقلابی لیڈروں کی صف میں کھڑے ہوتے۔ مطالعہ اور تجربہ یہی بتاتا ہے کہ جب سیاستدان رومان اور زمینی حقائق میں توازن پیدا کرنے کی کوششیں کرتا ہے تو وہ بے شمار مصلحتوں اور پھر منافقتوں کا اسیر ہو جاتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر وہ اس تبدیلی کا ایجنٹ اور ذریعہ بننے میں ناکام ہو جاتا ہے جس کی امید اور توقع عوام لگائے بیٹھے ہوتے ہیں یا جو خواب اس نے عوام کی نگاہوں میں بسائے ہوتے ہیں چنانچہ ایسے سیاستدان عام طور پر لیڈر نہیں بن سکتے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ نواز شریف کا بھی ہے جسے عزیز خورشید ندیم زمینی حقائق کی بدولت جوں کے ایشو پر ایسا موقف اپنانے کا مشورہ دے رہے ہیں جو ”ہینڈل پارٹی“ کے لئے قابل قبول ہو۔ دراصل زمینی حقائق کو بھی اپنی اپنی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ندیم صاحب کے مشورے کے مطابق مسلم لیگ (ن) کو پی پی پی کے آئینی چیلنج سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے کیونکہ مسلم لیگ (ن) اکیلی جوں کو بحال نہیں کر سکتی، اس کا لازمی نتیجہ پی پی سی او کے تحت حلف اٹھانے والے جوں کو قبول کرنا اور پرویز مشرف کے 3 نومبر کے اقدامات پر مہر تصدیق ثبت کرنا ہوگا جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سال پر محیط ساری جدوجہد جس میں وکلاء، سول سوسائٹی اور میڈیا نے لیڈرز کا کردار سرانجام دیا، اس کی نفی کر دی جائے۔ نواز شریف کا عدلیہ سے رومان ایک اصولی موقف ہے۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ یہ عدلیہ کو آزار اور مضبوط بنانے کا آخری موقع ہے۔ جن جوں نے اپنے عہدوں کی قربانی دی اگر انہیں اپنا مقام نہ دلا یا گیا تو آئندہ کوئی جج بھی کسی امر کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اسے دوسرے الفاظ میں عظیم دھوکہ بھی کہا جاسکتا ہے اس لئے اگر نواز شریف پی پی پی سے اس ایشو پر سمجھوتہ کر کے اپنے اصولی موقف سے ہٹتے ہیں تو ان کی سیاست کو محض شعبہ بازی کا نام دیا جائے گا جس سے ان کی عوامی حمایت کو شدید دھچکا لگے گا اور عوام کی امیدوں کو بھیس پینچے گی۔ یاد رکھئے کہ عوامی حمایت کے بغیر سیاستدان فضا میں معلق ہوتا ہے اور یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ عوامی حمایت کی کمزوری سیاستدان کو لیڈر بننے کے خواب سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لئے میں خلوص نیت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ مصلحتوں کا تابع ہو کر اب تک کی ساری سیاسی کمائی گنوانے کی بجائے اگلے انتخابات کا انتظار کرنا نواز شریف کے لئے بہتر آپشن ہے جب وہ اس ایجنڈے اور منشور کے ساتھ میدان میں اتریں اور عوامی طاقت کے ذریعے تبدیلی لائیں۔ اس صورت میں انتخابات کچھ زیادہ دور نہیں لگتے۔ ملک کی بقاء اور دوسرے ایشوز پر انشاء اللہ کل۔ (جاری ہے)



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »

Aam Aur Seiya

July 7th, 2008

## آم اور سر یا

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

یارو مجھے کیوں چھڑتے ہو، میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھا ہوا ہوں، مجھے بیٹھا رہنے دو، جہیں اٹھکیلیاں سو جی ہیں ہم تو بیزاری بیٹھے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس موضوع پر کالم لکھو اور کوئی اپنے دل کی بھڑاس میرے قلم کے ذریعے لگانا چاہتا ہے۔ بعض حضرات تو جو بیزاری اس طرح دیتے ہیں کہ پورا کالم فون پر پڑھ دیتے ہیں۔ نہ جانے یہ لوگ خود کالم نگاری کیوں نہیں کرتے؟ شاید مارکیٹ میں موجود کالم نگاروں کی تعداد..... بیٹھا تعداد دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ اب تو جب سے یہ خبر گرم ہوئی ہے کہ کالم نگار حضرات نہ ہی صرف اخبارات سے بلکہ دوسرے ذرائع سے بھی ڈھیروں روپے کماتے ہیں تو چوروں نے کالم نگاروں کے گھروں کا سراغ لگانا شروع کر دیا ہے۔ بیچارے محمود شام بھی اسی ”مغلطے“ کا شکار ہوئے۔ چوروں کا خیال تھا کہ وہ کالم نگار ہیں حالانکہ وہ ”ایڈیٹر صاحب“ ہیں اور موجودہ دور میں کالم نگار ایڈیٹروں سے کہیں زیادہ ریش پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے یہی خواہوں نے شام صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کالم نگاری نہ کیا کریں ورنہ چور صاحبان دوبارہ آسکتے ہیں اور اس بار وہ ”کیش“ لئے بغیر نہیں ملیں گے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بعض حضرات تو فون پر کالم لکھنے کی جو بیزاری اس طرح دیتے ہیں کہ پورا کالم سنا دیتے ہیں۔ آج صبح ہی صبح ایک صاحب کا فون آیا۔ تعارف کے طور پر یہ کہنا تو ضروری ہوتا ہے کہ میں کبھی آپ کا کالم ”مس“ نہیں کرتا اور اکثر اوقات آپ کے کالم کاٹ کر رکھ لیتا ہوں۔ نہ جانے کس مقصد کے لئے کاٹ کر رکھتے ہیں؟ بچوں کے طوطے بنانے کے لئے یا سوسوں کے لفافے بنانے کے لئے..... بہر حال وہ قاری صاحب مصرختے کہ آپ نے زرداری صاحب کے میاں صاحب کو بھجوائے گئے آموں کی مٹھاس پر کچھ نہیں لکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ میاں نواز شریف کے اس تہرے سے بے حد محفوظ ہوئے ہیں کہ زرداری صاحب کے آم بھی زرداری صاحب کی طرح بیٹھے اور لنڈ ہیں۔ بلاشبہ زرداری صاحب بیٹھے انسان ہیں اور ان کی یہی مٹھاس میاں صاحب کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے وہ اس طرح کہ میاں صاحب کی پارٹی اور ان کی پارٹی کے سیاسی ”باز“ غصے سے اہل رہے ہیں اور وہ جولاہی کے پہلے دو ہفتوں میں آریا پارکر دینا چاہتے ہیں، یعنی وہ بیگانہ دہل کہہ رہے ہیں کہ زرداری صاحب پندرہ دنوں کے اندر اندر صدر صاحب کا مؤاخذہ کریں اور ججوں کو بحال کریں ورنہ وہ کوآلیشن یا اتحاد سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ وہ میاں صاحب پر دباؤ بڑھا رہے ہیں اور انہیں کسی قطعی اقدام پر مجبور کر رہے ہیں۔

لیکن ہر بار ہوتا یہ ہے کہ جب میاں صاحب قطعی اقدام کی جانب بڑھنا شروع کرتے ہیں تو زرداری صاحب اپنی مسکراہٹ اور مٹھاس کے ساتھ ”عملہ آؤ“ ہوتے ہیں اور میاں صاحب کو محبت سے چاروں شانے چت گرا کر چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں بھی ایسا ہی ہوا کہ جب میاں صاحب ٹھک آمد جنگ آمد کے موڈ میں تھے تو زرداری صاحب نے رائے ونگل میں کھانا کھانے کی فرمائش کر دی، حالانکہ میاں صاحب کا کھانے کا ذوق ماشاء اللہ ساری دنیا میں مشہور ہے اور وہ کھانے کا اس قدر راہتمام کرتے ہیں کہ جب معاہدے کے بعد جزل پرویز مشرف نے انہیں ربا کر کے سعودی عرب جانے کی اجازت دی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے خاص باورچی کو ساتھ لے جانے کی فرمائش کی، کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جان ہے تو جہان ہے، کھانا ہے تو زندگی ہے اور زندگی ہے تو اقتدار ہے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میاں صاحب کھانے کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اس کے باوجود زرداری صاحب کو ان کے باورچی پر بھروسہ نہ تھا، چنانچہ زرداری صاحب نے خاص طور پر اپنا باورچی بھیجا جسے وہ ہمیشہ ہم رکاب رکھتے ہیں۔ کھانے پینے کی اسی احتیاط کے سبب ماشاء اللہ ہمارے تمام لیڈروں کے چہروں پر قابل رشک صحت کی فراوانی اور بے فکری کی روشنی نظر آتی ہے حالانکہ وہ دن رات قوم کی غربت، بدحالی اور مہنگائی کا غم کھاتے ہیں، البتہ غم کھانے والے کا چہرہ دیکھنا ہوتو کسی وقت قائد اعظم کی تصویر پر بے چہرے کو دیکھنے جو ہڈیوں کا مجموعہ دکھائی دیتا ہے۔ چلئے

1947ء کی بات چھوڑیے کہ وہ عمر رسیدہ اور بیمار تھے۔ قرارداد پاکستان کے وقت 1940ء کی تصویر دیکھ لیجئے۔

گزشتہ دنوں پیرنگ ڈاکٹر صاحب کے ہاں 76 سال کی عمر میں ماشاء اللہ بچی کی پیدائش کی خبر سن کر میں نے کراچی میں ان کے حکیم صاحب کو فون کیا اور ان سے اس کرامت کا راز پوچھا تو جواب ملا ”بے فکری“ اور ساتھ ہی حکیم صاحب مسکرا کر کہنے لگے اس میں میرے کشتوں کا کوئی قصور نہیں۔ اصل کشتہ بے فکری، خوشحالی اور اعلیٰ خوراک کی فراوانی ہوتا ہے۔ اس رات کسی قریب کے کوالے سے میں نے پیر صاحب کو فکری باؤس میں انٹرویو دیتے ہوئے ٹیلی ویژن پر دیکھا تو ان کا صحت مند بھرا بھرا چہرہ دیکھ کر جی چاہا کہ کالم نگاری چھوڑ کر میری مریدی کا کاروبار شروع کر دوں لیکن پھر جوانی میں پڑھا ہوا یہ مصرعہ راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ آخری ”عمر“ میں کیا خاک مسلمان ہوں گے، بات دور نکل گئی۔ وہ قاری صاحب جو مجھے فون پر کالم سن رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ زرداری صاحب کی مسکراہٹ اور ان کے آموں کی مٹھاس نے میاں صاحب کو بے بس بنا رکھا ہے۔ یوں بھی ہمارے لیڈران صاحبان اپنے مؤقف بدلتے رہتے ہیں اور ایک جگہ پر ڈٹ کر کھڑے نہیں ہوتے۔ میاں صاحب ججوں کے مسئلے پر اصولی مؤقف اختیار کئے، پی سی او جج کو نکالنے پر تھے ہوئے ہیں لیکن ان کی مسلم لیگ (ن) نے فنانس بل میں ججوں کی تعداد بڑھانے کے حق میں ووٹ دے کر ان کے اصولی مؤقف کی نفی کر دی ہے۔ زرداری صاحب گزشتہ چار پانچ ماہ سے قدرے تیزی سے اپنا مؤقف بدلتے رہے ہیں اور اب تو وہ اس فن میں ماہر ہو چکے ہیں۔ امین فہیم کی نامزدگی سے لے کر ججوں کی بحالی اور بھور بن معاہدے سے لے کر صدر صاحب کے مؤاخذے تک وہ قوم کو مسکراہٹ اور مٹھاس کی مار دیتے رہے ہیں۔ رسم دنیا ہے کہ دوست کے تجھے کے جواب میں تھک جیجا جاتا ہے۔ میاں صاحب کو چاہئے کہ وہ زرداری صاحب کے آموں کے جواب میں ان کو اتفاق ملز کا سراپا بھیجیں کیونکہ یہ سریانہ جھکتا ہے، نہ اپنی جگہ سے ہلتا ہے، اس وقت زرداری صاحب میں دھم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود اگر زرداری صاحب مٹھاس کی مار دیتے رہیں تو پھر دم مست قلندر کہ چودہ اگست قریب ہے۔ چودہ اگست یوم آزادی ہے اور زنجیروں کو توڑنے کا دن ہے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »

Iss Muqabley Mien Ehtiyaat..

July 3rd, 2008

## اس مقابلے میں احتیاط کی ضرورت ہے

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

میں میز پر کتب کھولے بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف سے کسی صاحب نے میرے نام کی تصدیق کرنے کے بعد کہا کہ بڑی مشکل سے آپ کا نمبر ملا ہے۔ میں پریشان ہوں اور میرا جی بھرا ہوا ہے۔ سوچا کہ آپ کے کالم پڑھتا ہوں کیوں تاہم اس بھی آپ کے سامنے نکالوں۔ ڈاکٹر صاحب یہ ملک رہنے کے قابل نہیں۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا کہ کیوں اس ملک نے کیا قصور کیا ہے؟ فرمانے لگے گویا آپ نے اخبار نہیں پڑھا۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ درست فرماتے ہیں۔ میں نے اخبار نہیں اخبارات پڑھے ہیں جن کی تعداد پانچ چھ ضرور ہوگی۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ آپ نے اس میں وہ خبر پڑھی ہے کہ ایک سابق جج ہائی کورٹ مصطفیٰ اسماعیل قریشی 1986 سے یعنی گزشتہ بائیس برسوں سے جیل میں پڑا ہل سڑ رہا ہے اور اس کا گناہ فقط اتنا ہے کہ اس نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں ان کی بیگم صاحبہ یعنی خاتون اول کو عدالت میں حاضر ہونے کے لئے سمن جاری کرنے کی جسارت کی تھی جس کے بعد اس پر جعلی مقدمات بنا کر جیل میں پھینک دیا گیا اور آج بائیس برسوں بعد پریس کو اس کا ظلم ہوا ہے۔ اس دوران اس کی دو بیویاں بھائی اور والدین انتقال کر گئے ہیں اور وہ دنیا میں ایک دتہ بارہ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان صاحب کی آواز بھرا گئی مجھے محسوس ہوا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ صاحب رونے لگے ہیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا کہ جس ملک میں ہائی کورٹ کے سابق جج کے ساتھ ایسا ہوتا ہو وہاں عام شہری کا کیا حال ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب یہ ملک رہنے کے قابل نہیں، آپ مہربانی فرما کر اس پر کالم لکھیں۔

میں نے ان صاحب کو تسلی دی اور عرض کیا کہ بے شک ہمارے ملک میں عدالتوں کا یہی حال ہے اور بے شک عام شہری انصاف سے محروم ہے، اسی لئے سول سوسائٹی نے عدلیہ کی آزادی کی تحریک شروع کر رکھی ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ صورتحال اتنی بھی تاریک نہیں جتنی آپ بیان فرما رہے ہیں اگر وہ شخص واقعی ہائی کورٹ کا جج رہا ہوتا اور مقدمات جعلی ہوتے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کا مقدمہ اس طرح میں برسوں تک عدالتوں میں دھکے نہ کھاتا رہتا۔ اب تک پریس میں ہزاروں بار ذکر ہو چکا ہوتا، اگر مقدمات جعلی تھے اور قصور صرف خاتون اول کو سمن جاری کرنا تھا تو 1988 میں بینظیر بھٹو کی حکومت آتے ہی وہ شخص رہا ہو جاتا تو نہ جب بینظیر بھٹو دوسری بار وزیراعظم بنی ہیں تو وہ بہر حال باہر آ جاتا اور اس شخص کے ساتھ ہونے والے ظلم کو ضیاء حکومت کے خلاف استعمال کیا جاتا۔ انسانی حقوق کی انجمنیں اسے سونے کے میڈل پہناتیں اور این جی اوز اس کے ساتھ شامیں مانتیں۔ میں نے ان صاحب کو سمجھانے کی کوششیں کی کہ یہ معاملہ میری سمجھ سے باہر ہے کہ اس کا والد سابق سفیر اور سابق وائس چانسلر بتایا جاتا ہے اور وہ شخص ضیاء الحق کی 1987 میں وفات کے بعد بھی اپنے بیٹے پر بنائے گئے انتقامی مقدمات ختم نہ کروا سکا۔ 1987 میں وہ فقط ایک پریس کانفرنس کر دیتا تو مصطفیٰ قاضی جیل سے باہر آ گیا ہوتا۔ میرے تمام دلائل کے باوجود وہ صاحب مصر تھے کہ میں اس ظلم پر کالم لکھوں کیونکہ لوگ بے حد پریشان ہیں اور ہر جگہ آج یہی مقدمہ زیر بحث ہے۔ لوگ اس اندھیر نگری سے مایوس ہو چکے ہیں۔ بالآخر میں نے ان صاحب سے عرض کیا کہ اول تو مزاج میں کسی کے کہنے پر کالم نہیں لکھتا پھر وہ لکھتا ہوں جو جی میں آتا ہے ذہن میں کلبلا تا اور قلم سے خود بخود نکلنے لگتا ہے۔ دوم مجھے یہ سارا معاملہ ہی مشکوک لگتا ہے اس لئے میں جذبات کی رو میں بہہ کر قلم کی سیاسی ضائع نہیں کروں گا۔ آپ چند دن انتظار کریں شکوک کے سائے چھٹ جائیں گے۔ وہ صاحب مجھ سے خفا ہو گئے اور میں پریشان ہو کر سوچوں میں گم ہو گیا۔

پھر اس کے بعد ہمارے کالم نگار، خواہ تین و حضرات، میدان میں کود پڑے اور اپنے اپنے زور قلم کے جوہر دکھانے لگے بلکہ یوں سمجھئے کہ پھر کالم نگاروں میں مقابلہ شروع ہو گیا کہ کون اس مسئلے پر لوگوں کو زیادہ رلاتا ہے، کون اس ظلم کے خاکے میں زیادہ رنگ بھرتا ہے، کون زیادہ اچھا مرثیہ لکھتا ہے اور کون اپنے قلم کے نشتر سے معاشرے کے ناسوروں کو بہتر انداز سے بے نقاب کرتا ہے۔ گویا شام غیر بیاں کا سا منظر تھا، میں الفاظ کے سمندر کے کنارے بیٹھا یہ مقابلہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ ایک عزیز کی کالم نگار نے یہ دعویٰ تک کر دیا کہ مصطفیٰ قاضی کے ظلم و فضل سے متاثر ہو کر مصر کے مرحوم صدر کرمل جمال ناصر نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی تھی اور پھر اس کے بعد مصطفیٰ قاضی کے ظلم و فضل پر کچھ اس طرح کی مبالغہ آمیز غزلیں بربزبان نکل گئیں کہ کامن سنس اپنا سر پٹینے لگی۔ میں مرثیہ نما کالم پڑھ کر سوچتا رہا کہ یا اللہ ایسا جوہر قابل کہاں چھپا ہوا تھا جسے مصر کے طاقتور صدر جمال ناصر نے اپنی بیٹی دے دی اور اس شادی کی خبر تک پاکستان کے اخبارات میں نہیں چھپی جبکہ اردن کے سابق ولی عہد کی پاکستانی لڑکی سے شادی کئی دہائیوں تک ہمارے لئے باعث افتخار رہی رہی اور ہم اس شادی کے حوالے سے اردن کو اپنے قلب و جگر کا حصہ بنائے بیٹھے رہے۔ ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کرمل جمال ناصر سے بھی ہمارا اتنا ہی قریبی رشتہ ہے۔

تفصیل میں جانے کا کیا فائدہ؟ بہر حال چند ہی روز گزرے تھے کہ اخبارات میں پے در پے خبریں آنا شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے ہائی کورٹ نے پریس ریلیز جاری کی کہ اس نام کا کوئی شخص کبھی ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ یا جج نہیں رہا اور ساتھ ہی پریس کو نصیحت کی گئی کہ خدارا افسانوی کہانیاں چھاپنے سے پہلے تھوڑی سی تحقیق کی زحمت کر لیا کریں۔ ابھی ہمارا پریس قاضی غلام مصطفیٰ المعروف جسٹس مصطفیٰ اسماعیل قاضی کی مداح اور ہمدردی میں رنگین رہ پورٹیں چھاپ کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کر رہی رہا تھا کہ ایک تحقیقی رپورٹر نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ یہ صاحب دھوکہ دہی اور جھلسا زنی وغیرہ کے متعدد مقدمات میں ملوث ہیں۔ ماشاء اللہ ضیاء الحق، جو نیچو اور جو نیچو کے پرسنل سیکرٹری وغیرہ وغیرہ کے جعلی لیٹر پیڈ تیار کر کے اور جعلی خطوط جاری کر کے تقریباً ایک کروڑ روپے لوگوں سے تھتھیا چکے ہیں۔ جعلی ویزوں اور بیرون ملک ملازمتوں کا لالچ دے کر ان گنت غریبوں کو لوٹ چکے ہیں۔ ایک خط جعلی میں مولانا عبدالستار ایچی ان کے خلاف گواہی دے چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ شخص دھوکے بازی اور جعلی سازی میں اس قدر ماہر ہے کہ اپنی موت کا جعلی شہادیت میونسپل کارپوریشن حیدرآباد سے بنوا کر دے چکا ہے۔ تفصیلات اکثر اخبارات میں چھپ چکی ہیں لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ مصطفیٰ قاضی بہر حال بہت بڑا

جعل ساز ہے جو ہمارے تربیت یافتہ رپورٹروں اور ہمارے نہایت ذہین و فطن کالم نگاروں کو اپنے دکھ کے جذبات میں بہانے میں کامیاب ہو گیا ہے، وہ اپنی ذات پر لکھی جانے والی دغریب کہانیوں کا ہیرو بن کر ابھرا ہے اور عدالت میں آتے ہی اخبارات کو لہراتا اور مسکراتا ہے۔ مسکراتا اپنی کامیابی اور ہماری نالائقی پر ہے۔

سوچنے کی بات اتنی ہی ہے کہ صحافت کے میدان میں یہ جعلی مقابلہ، رنگ آمیزی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش اور بغیر تحقیق افسانوی رپورٹنگ اور اس پر ہمارے کالم نگاروں کی شاعرانہ طبع آزمائی ہمیں کہاں لے جائے گی؟ کیا اس سے ہماری صحافت کا تقدس مجروح نہیں ہوگا؟ کیا اس سے قارئین کے اعتماد کو نہیں پہنچے گی؟ قلم کی غلطی تو اس کی غلطی سے کہیں زیادہ گہرے زخمی لگاتی ہے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

**Peraai Aag**

July 1st, 2008



## پرائی آگ

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

اسے اپنی قومی بدقسمتی ہی کہنا چاہئے کہ ہمیں بحیثیت قوم گزشتہ ساٹھ برسوں میں سکھ کے لمحات کم نصیب ہوئے ہیں جبکہ ہم اکثر اوقات دکھ کی چٹائی میں جلتے رہے ہیں۔ داخلی صورتحال سے قطع نظر ہمیں خارجی فرٹ پر شروع ہی سے نہایت گھمبیر مسائل کا سامنا رہا ہے جو ہماری داخلی صورتحال کو بھی کئی طریقوں سے متاثر کر کے ہمارے لئے نت نئی مشکلات پیدا کرتے رہے ہیں۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ ممالک جن کی سرحدوں پر امن کا پہرہ ہوتا ہے اور جن کے محافظ سکھ کی نیند سوتے ہیں۔ ہماری قیادت کو ملک کے معرض وجود میں آتی ہی دو اہم، بنیادی اور خوفناک مسائل درٹے میں ملے جو ہمارے اپنے پیدا کردہ نہ تھے اور ان چیلنجوں کے سائے گزشتہ ساٹھ برسوں سے ہماری بقا اور استحکام کے افق پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہمارا زیادہ عین الاقوامی بارڈر ہندوستان کے ساتھ مشترک تھا جس نے آغاز ہی سے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا اور تقسیم ہند کے پلان پر تہرہ کرتے ہوئے نہ ہی صرف آل انڈیا کانگریس بلکہ جواہر لال نہرو نے بھی کہا تھا کہ وہ بد امر مجبوری تقسیم کو قبول کر رہے ہیں لیکن انہیں یقین ہے کہ جب جذبہ کی آگ ٹھنڈی ہوگی تو پاکستان ہندوستان کا حصہ بن جائے گا۔ اس پر دوسری افتاد یہ آن پڑی کہ انگریزوں نے ہندوستان کی تقسیم میں بد نیکی کی ڈنڈی ماری، کئی مسلم اکثریتی علاقے جو بہر حال پاکستان پاکستان کو ملے تھے، ماؤنٹ بٹن کی انڈیا نوازی کے تحت ہندوستان کو مل گئے اور ساتھ ہی کشمیر کے مسئلے کو ادھورا چھوڑ دیا گیا، جو پاکستان اور ہندوستان میں ستمبر 1947ء سے جنگ کا باعث بن گیا اور بعد ازاں ہندوستان پاکستان کے تعلقات میں بد امنی، تلخی اور دشمنی کی جڑ بن گیا۔ دوسری طرف پاکستان کی پشت پر واقع مسلمان مملکت افغانستان وہ دنیا کا واحد ملک تھا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت یا داخلے کے خلاف ووٹ دیا کیونکہ وہ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ گویا پاکستان دو مخالف ممالک کے درمیان ”سینڈ وچ“ بن کر رہ گیا۔

ان سرحدی تنازعات نے پاکستان کو مضبوط دفاع اور بڑی فوج رکھنے پر مجبور کیا چنانچہ شروع ہی سے تعلیم، صحت، سماجی ترقی وغیرہ کی بجائے دفاع ہماری پہلی ترجیح قرار پایا اور ہم پیٹ کاٹ کر اپنے بجٹ کا تقریباً ساٹھ فیصد دفاع پر صرف کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ اس طرح ہماری فوج اتنی طاقتور ہو گئی کہ وہ سیاسی قیادت کے کمزور ہوتے ہی ملکی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگی اور پھر ایک دن 1958ء میں پورا ملک فوج کے زیر تسلط آ گیا، جس پر تہرہ کرتے ہوئے ہندوستانی وزیر اعظم نہرو نے چھٹی کسی تھی:

Well done General, you have conquered your own country.

ترجمہ: بہت اچھے جزل صاحب، آپ نے اپنی ہی ملک فتح کر لیا۔

اور پھر اس کے بعد بار بار فوج اپنی ہی ملک فتح کرتی رہی، البتہ اسی فوج کو جب بھی ہندوستان سے نیرو آڑا ہوتا پڑا وہ 1965ء ہو یا 1971ء، بد قسمتی سے اس کی کارکردگی قابل رشک نہ رہی۔ ظاہر ہے کہ جب فوج سیاست میں ملوث ہو جائے اور سرحدوں کی حفاظت کی بجائے حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ حاکم بدہن! مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر خدا خواست ہمارے جرنیل اپنے سیاسی عزائم سے باز نہ آئے تو ایک دن قوم یا تھ جائے کہ حکومت کے سامنے کھڑی ہو جائے گی کہ ہمیں بڑی فوج نہیں چاہئے، اس کا سائز کم کرو کیونکہ ایسی قوت بننے کا مقصد بھی یہی تھا کہ فوج کا سائز گھٹایا جائے اور تعلیم و صحت پر زیادہ رقم خرچ کی جائے لیکن نائن الیون کے بعد افغانستان کی بگڑتی ہوئی صورتحال نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا۔

کشمیر کی مانند ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ بھی اتار چڑھاؤ کا شکار رہا ہے کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم..... ڈاکٹر صفدر محمود نے آخری دور میں بھی تو بھٹو صاحب نے ایک غیر ملکی صحافی کو بتایا تھا کہ جلد ہی پاکستان اور افغانستان کنفیڈریشن کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے جس سے اس خطے میں امن کی بنیاد پڑ جاتی لیکن ہمارے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جب کوئی اہم پیش رفت ہمارے دروازوں پر دستک دیتی ہے تو فوج تشریف لے آتی ہے جو اپنی کم فنی اور سیاسی بصیرت کے فقدان کے سبب معاملات بگاڑ دیتی ہے۔ بھٹو صاحب افغان صدر سے کنفیڈریشن کی تفصیلات طے کر چکے تھے کہ جزل ضیا الحق صاحب تشریف لے آئے اور سارے سمجھوتے کی بساط لپیٹ دی گئی۔ 1999ء میں نواز شریف، واپس آئے کشمیر کے مسئلے کے حل کی جانب بڑھ رہے تھے کہ جزل پر ویز شرف نے ”کارگل“ کر دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اسی لئے کچھ دل چلے یہ کہتے ہیں کہ امن فوج کو مستحق نہیں کرتا۔

تفصیلات کو اختصار کے کوزے میں بند کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے اور خاص طور پر نائن الیون کے بعد پاکستان دراصل افغانستان کی ہمسائیگی کی سزا بھگت رہا ہے۔ روس کے خلاف افغان جہاد کی باقیات نے ہماری زندگی ایجرن کر رکھی ہے۔ روی انخلاء کے بعد اگر افغان اور پاکستانی حکومتیں مل کر غیر ملکی جہادیوں کو اپنے اپنے وطنوں اور ممالک میں واپس بھجوا دیتیں اور افغانستان میں ایک قابل قبول حکومت قائم ہو جاتی تو شاید حالات کا نقشہ اتنا نہ بگڑتا لیکن افغانستان کے انتشار، افراتفری اور خانہ جنگی نے مل کر وہ مسائل پیدا کئے کہ ہم آج تک ان کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔

گزشتہ کچھ عرصے سے سرحدی علاقوں خاص طور پر وزیرستان اور پھر سوات، جنڈولہ، مہمند ایجنسی یعنی فائنا کے علاقوں میں مذہبی انتہا پسند غالب ہیں، جنہوں نے بعض علاقوں میں متوازی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں۔ لڑکیوں کے سکولز جلانے جارہے ہیں، افواج پاکستان، فرنٹیر کانسٹیبلری اور سرکاری ملازمین کو یاغواء کیا جا رہا ہے یا پھر تہ تیغ کیا جا رہا ہے۔ مقامی طالبان کے علاوہ کئی اور لشکر اسلامی نفاذ شریعت اور لشکر انصار اور نہ جانے کون کون سے مجاہدین جنم لے رہے ہیں۔ جنہوں نے ان علاقوں میں حکومتی رٹ ختم کر دی ہے۔ انتخابات کے بعد صوبہ سرحد میں بننے والی اے این پی کی حکومت نے خلوص نیت سے ان گروہوں کے ساتھ امن معاہدے کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے نتیجے کے طور پر عارضی طور پر امن بھی بحال ہوا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ صوبہ سرحد کی حکومت کا فائنا پر کوئی کنٹرول نہیں کیونکہ فائنا مرکزی حکومت کے زیر نگرانی ہے جبکہ فائنا اور صوبہ سرحد کا امن ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ مرکزی حکومت اور



صوبائی حکومت میں ہم آجنگی کے فقدان اور حکمت عملی کے تضاد نے بھی اس مسئلے کو مزید گھمبیر بنایا ہے۔ دوسری طرف امریکہ کا دباؤ اپنی جگہ پر ہے جو صرف طاقت کے استعمال میں یقین رکھتا ہے اور (Hot Pursuit) گرم تعاقب کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ افغان حکومت، امریکہ اور نیٹو کا کہنا ہے کہ چونکہ حملہ آور فائو زستان کے علاقوں سے آرہے ہیں اس لئے ان کو صوبہ سرحد میں جہاں جہاں بھی جہادی نظریات آئیں گے وہ ان پر حملہ کریں گے۔ آپ اس حکمت عملی کے عملی مظاہرے دیکھ بھی چکے ہیں۔ ایک طرف یہ خبریں آرہی تھیں کہ مذہبی انتہا پسند پشاور کے قریب پتلی چکے ہیں تو دوسری طرف سوات کے بعض علاقوں میں غیر ملکی جنگجو عناصر اور ہمارے انتہا پسندوں کے جمع ہونے کی خبریں تشویش پیدا کر رہی تھیں کیونکہ نیٹو فورسز یہ دھمکی دے رہی تھی کہ اگر حکومت پاکستان ان کا ”علاج“ نہیں کرتی تو پھر ہم ان کے ٹھکانوں پر حملے کریں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو الجھانے میں ہمارے وزیر داخلہ نے بھی اپنا حصہ ڈال دیا ہے جو صوبائی حکومت سے بالا بالا آرمی ایکشن کی تیاری کے لئے زمین ہموار کرتے رہے کیونکہ امریکہ کی یہی خواہش تھی۔

بہر حال اب جبکہ آرمی ایکشن کا آغاز ہو چکا ہے اور صلح نامے اور سمجھوتے ناکام ہو چکے ہیں تو پھر حکومت کو تین محاذوں پر موثر حکمت عملی اپنانی ہوگی۔ اول تو ان تمام متاثرہ علاقوں کا اس طرح محاصرہ کر لیا جائے کہ وہاں سے خودکش حملہ آور اور تحریک کار ملک کے دوسرے حصوں میں نہ جاسکیں۔ دوم اگر آرمی ایکشن ناگزیر ہی تھا تو اسے اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ سارے متاثرہ علاقوں میں نارمل زندگی، حکومتی رٹ اور امن بحال کیا جائے اور ان علاقوں کو انتہا پسندوں سے مکمل طور پر صاف کیا جائے ورنہ یہ خطرہ بار بار سر اٹھاتا رہے گا۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل کام ہے جسے صرف محنت، احتیاط، جانفشانی اور جذبے سے ہی پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے ورنہ اگر اسے نیم دروں اور نامکمل چھوڑ دیا گیا تو اس کی سزا پوری پاکستانی قوم طویل عرصے تک بھگتی رہے گی۔ سوم عالمی سطح پر اپنے اقدام کا جواز اس انداز سے پیش کیا جائے کہ پاکستان کا امیج بہتر ہو، اس سے خطرناک ملک کا لیبل اترے اور اندرون ملک امن کا تاثر قائم ہو۔

ہم تو دعا گو قسم کے لوگ ہیں صرف دعائیہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو امن اور استحکام کی نعمت سے مالا مال کرے لیکن ساتھ ہی ہم وطن کو یہ وارننگ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ احتیاط کی بیلٹ (Belts) کس کر باندھ لیں اور خودکش حملوں اور بم دھماکوں کے لئے تیار ہو جائیں.....!! پرانی آگ نے ہمارے دامن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، خدا جانے ہم کب تک اس میں جلتے رہیں گے؟



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »  
Page 6 of 31 «345678910»...Last »